OUKA
The University of Osaka
Institutional Knowledge Archive

| | |
|---|---|
| Title | Pakistani Urdu Short in Its Contemporary Perspective |
| Author(s) | Ahmad, Anwaar |
| Citation | 大阪大学世界言語研究センター論集. 2010, 2, p. 87-93 |
| Version Type | VoR |
| URL | https://hdl.handle.net/11094/5862 |
| rights | |
| Note | |

*The University of Osaka Institutional Knowledge Archive : OUKA*

https://ir.library.osaka-u.ac.jp/

The University of Osaka

# Pakistani Urdu Short Story in Its Contemporary Perspective

AHMAD Anwaar

Abstract:

In this paper an overview of the trends and social impact of Urdu Short Story in Pakistan during the last decade has been presented. During this decade some stalwart story tellers passed away like Ahmad Nadeem Qasmi, Ashfaq Ahmad and Qurratul Ain and an under tone question about the future of Urdu short story is being heard and felt if it is not asked. This decade also saw another transition in Pakistani society from military dictatorship to democratic set up, but with a difference now that the question of "failed state" is being discussed more loudly by Pakistani writers and intellectuals themselves. Proxy war between Saudi Arabia and Iran in Pakistan and a big game by super powers have changed the complexion and human face of the society. As, this literary genre is quite popular in Urdu and has a tradition of true reflection of socio-political scenario, this article may invoke response and generate interest among the serious readers of Urdu literature. Author of this article has contributed a voluminous book about the growth and development of Urdu short story as well.

**Keywords**：Contemporary Pakistani Literature, Urdu Short Story, Literary Criticism
**キーワード**：現代パキスタン文学，ウルドゥー短編小説，文学批評

# پاکستانی اُردو افسانے کا منظر نامہ گزشتہ عشرے میں

ڈاکٹر انوار احمد

گزشتہ ایک عشرے میں اُردو کے جو بڑے افسانہ نگار اِس دنیا سے رخصت ہوئے اُن میں احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، قرۃ العین حیدر، ابوالفضل صدیقی، آغا بابر، شوکت صدیقی، محمد خالد اختر، حجاب امتیاز، صادق حسین سریندر پرکاش اور جاوید شاہین شامل ہیں، احمد ندیم قاسمی کے سولہ (۱۶) افسانوی مجموعے شائع ہوئے اُن کا آخری مجموعہ 'کوہ پیما' تھا جو ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا، اور بعد کے برسوں میں اُن کے چار افسانے شائع ہوئے جن میں سے ایک کے نیچے یہ نوٹ دیا گیا ہے 'اُس ناول کا پہلا باب جو ارادے کے باوجود لکھا نہ جا سکا' گویا گزشتہ دس برس کے پاکستانی افسانے کے منظر نامے پر نظر ڈالیں تو احمد ندیم قاسمی ایک اندازِ فکر اور اسلوب فن کے طور پر موجود تو تھے مگر ادبی حلقوں میں ان کی گونجنے والی کہانیاں 'سناٹا' (۱۹۵۲ء) اور زیادہ سے زیادہ 'بازارِ حیات' (۱۹۵۹ء) کے بعد تخلیق نہ ہو سکیں، اس لیے پاکستانی افسانے کے منظر سے رخصت ہونے والوں میں صرف اشفاق احمد آخر وقت تک بڑی کہانیاں تخلیق کرتے رہے اُن کی تخلیقی سرشاری اور شادابی کا یہ عالم تھا کہ سائنس فکشن کو اخلاقیات سے ہم آمیخت کرنے والے مجموعے 'طلسمِ ہوش افزا' (۲۰۰۰) کے بعد بھی اُن کے دو افسانوی مجموعے ایک ہی بولی (پھلکاری) اور 'صبحانے افسانے' شائع ہوئے یہ اور بات کہ جب اُن کی وفات کے بعد اُن کی خودنوشت یا مجموعہ ملفوظات 'بابا صاحبا' شائع ہوا تو اندازہ ہوا کہ اِس کتاب کے اجزا افسانوں کے طور پر بھی شائع ہو چکے تھے۔ دراصل اشفاق احمد بے حد طاقتور متکلم تھا اور اُس کے پاس اپنے علم اور مشاہدے کو کسی مخصوص نظریے میں ڈھالنے کی صلاحیت تھی۔ وہ انسانی روح اور دُکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں اُترنے کی صلاحیت رکھتا تھا عام اور سادہ سے مرکب اور تہہ دار صورتِ حال پیدا کرنا جانتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُس کے پاس اظہار کی غیر معمولی صلاحیت تھی، پنجابی کے روزمرے محاورے لوک دانش اور شعر و ادب کے اعلیٰ ترین نمونوں کا ذائقہ اُس کی زبان میں رچ بس گیا تھا مگر اُس کا متصوفانہ رویہ اتنا بے ساختہ بھی نہیں تھا اور اکثر جابر حکمرانوں کے کام بھی آجاتا تھا، موجودہ منظر پر نگاہ ڈالیں تو انتظار حسین، اسد محمد خان، رشید امجد، محمد منشا یاد، خالدہ حسین، مسعود اشعر، زاہدہ حنا اور فہمیدہ ریاض کے ساتھ آصف فرخی، ڈاکٹر شیر شاہ سید، ڈاکٹر انور زاہدی، نیلم احمد بشیر اور طاہرہ اقبال اُردو افسانے کے دامن کو فکری، فنی، ہیتی اور لسانی تنوعات عطا کر رہے ہیں۔ [اس وقت، بھارتی افسانہ نگار نیر مسعود، اردو افسانہ کی پہلی صف میں شامل ہیں] گر کوئی پاکستان کے سیاسی اور سماجی نظام کے تسلسل کے سبب یہ نتیجہ اخذ کر لے کہ غلامی اور آزادی میں کوئی زیادہ فرق نہیں، تو شاید یہ اتنا بڑا مغالطہ نہ محسوس ہو، ماجرا یہ ہے کہ جنگِ عظیم دوم کے بعد سامراجی ذہن نے 'مہذب' حربے اختیار کیے، امداد دینے والے ادارے قائم کیے، بھوکے اور غیر مہذب لوگوں کو زندگی کی اذیت سے نجات دلانے کے لئے ہلاکت خیز ہتھیار' آسان

شرائط' پر فراہم کئے، اپنے مفادات کو تقویت دینے والے سیاسی، سماجی نظام بھی چھوٹے ممالک ('دوست' ممالک) کو تحفے میں دیئے بسا اوقات تو 'حکمران' بھی عطا کئے، یوں تیسری دنیا کے نو آزاد ممالک میں سیاسی آزادی ایک واہمہ بن کر رہ گئی، دوسرا المیہ یہ رونما ہوا کہ مطلوبہ تعلیمی سرگرمی (فکری و ذہنی پس منظر کو روشن بنانے کے لئے) کے بغیر ضعیف الاعتقادی، جہالت، توہم اور پسماندگی کے اندھیرے میں بھٹکتے نو آزاد ممالک میں ان سپر پاورز نے اپنے مفادات سے ہم آہنگ صنعتی نظام اور مارکیٹ اکانومی قائم کرنے کی آزادانہ اور فراخ دلانہ کوشش کی۔ یوں صنعتی نظام کی تمام تر برائیاں تو ہمارے معاشرے میں پیدا ہوئیں، مگر سرمایہ دارانہ نظام کی بعض سہولتوں اور نعمتوں سے بیشتر لوگوں کا تعارف نہ ہو سکا۔ اس طرح ان بڑی طاقتوں کی سرپرستی میں ایک ایسا طبقہ پروان چڑھا جس کے پاس دولت ہی نہیں وافر سیاسی قوت بھی تھی۔ چنانچہ قیام پاکستان کے بعد بھی افسانے نے تلخی اور تلملاہٹ کا لہجہ تبدیل نہ کیا بلکہ اس میں ملال اور افسردگی کا اضافہ ہو گیا۔

اس میں شک نہیں کہ اُردو افسانے کے اُفق پر ہجرت یا مہاجرت کے احساس پر مبنی تخلیقی تجربہ بہت عرصے تک چھایا رہا یہ محض ماضی سے متعلق ایک جذباتی رویے کا عکس نہ رہا اور نہ ہی یہ بچھڑنے والے تہواروں، گلی کوچوں، باغوں پرندوں اور لوگوں کی کشش میں اسیر رہنے کا ایک کرشمہ رہا، بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ ایک پیچیدہ نفسیاتی رجحان بنتا گیا اور یہ بھی کہ نئے ماحول سے تہذیبی و ثقافتی موانست پیدا نہ ہو سکنے کے نفسیاتی اسباب بھی ہوں گے مگر اسکی وجوہات سیاسی اور معاشی زیادہ ہیں۔ بدقسمتی سے ہر حکمران پاکستان کو اس وعدے سے دور کرتا گیا کہ آزاد لوگوں کی شاداب سرزمین ہوگی، جہاں اکثریتی عقیدے کے مطابق ہر طرح کے استحصال سے آزاد معاشرہ اور منصفانہ و عادلانہ سماجی نظام قائم ہوگا۔ وسائل دولت پر کسی ایک فرد یا طبقے کا اجارہ نہیں ہوگا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پاکستان مستحکم اور ناقابل تسخیر ہوگا، مگر ہوا یہ کہ پاکستان کبھی بھی غیر یقینی حالات سے باہر نہیں آسکا، جس انتظار حسین نے ۱۹۵۹ء میں لکھا تھا ــــــ ''اگر پاکستان کا افسانہ نگار سن ستاون، معرکۂ کربلا اور جنگ بدر سے اپنا رشتہ جوڑے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس قوم کا جو نیا احساس تعمیر ہو رہا ہے اس میں وہ ایک ہزار سالہ ہند اسلامی تجربہ کو اور پونے چودہ سو سال تاریخی شعور کو بھی شامل کرنے کے لئے کوشاں ہے۔'' ('علامتوں کا زوال'، سنگ میل لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۲۲) اور جس نے 'آخری آدمی' اور 'شہر افسوس' کے افسانوں میں اسلامی دیو مالا تشکیل دینے کی کوشش کی؟ کس طرح اور کیوں افسردگی کے عالم میں ویران ہو کر ویدک دور میں اتر اکلیلہ و دمنہ کی کہانیاں لکھیں اور کیوں پھر ان کلیہ و دمنہ کو بھی پاکستان میں ہٹ لسٹ پر دیکھا اور اب برصغیر میں ایٹم بم کے پش بٹن پر ہاتھ رکھے جلادوں کی کایا کلپ کی آرزو شہرزاد کی کہانیوں سے رکھتا ہے۔

گزشتہ چند برسوں میں اردو افسانے میں 'جلاوطنی' کا احساس ابھرا ہے، بلاشبہ اس کا قوی محرک تو معاشی اسباب کی بنیاد پر نقل مکانی ہے۔ یورپ امریکہ اور کینیڈا کے ساتھ ساتھ مشرق وسطیٰ، دیکھتے ہی دیکھتے پاکستانیوں کے لئے کوہ ندا کا درجہ اختیار کر گئے وہاں سے مسلسل بلاوا آ رہا ہے اور پاکستانی بے اختیار کھنچے چلے جا رہے ہیں (بعض اوقات بلاوا بھی نہیں آتا، مگر کھنچے چلے جانے

والے اسی صدا کے فریب میں مبتلا رہتے ہیں ) اس صورتحال کے نفسیاتی ، سیاسی اور سماجی اسباب ہیں ۔ احساسِ شرکت سے محروم پاکستانی اپنے اجتماعی وجود کے بارے میں سوچنے اور اس کا اظہار کرنے کا حق نہیں رکھتے اس طرح ہجرت سے بھی زیادہ پیچیدہ اور المناک احساس نے جنم لیا، یہ بے گھری کا مسئلہ نہیں، گھر میں رہ کر بے گھری اور وطن میں بستے ہوئے جلاوطنی کا معاملہ ہے۔ مشرق وسطیٰ اور دیگر بیرونی ممالک میں مقیم پاکستانی جو روپیہ اندرونِ ملک بھیجتے ہیں اس سے زرمبادلہ کے ذخائر کتنے بڑھتے ہیں اور افراطِ زر میں کتنا اضافہ ہوتا ہے اس کا اندازہ تو ہر وزیرِ خزانہ کی بجٹ تقریر سے ہو جاتا ہے، مگر اس کے نتیجے میں ہمارے اخلاقی اور سماجی ڈھانچے اور قدروں کو جس طوفان کا سامنا ہے اس کی خبر ہمارا افسانہ دے رہا ہے۔

ترقی پسند تحریک میں مخالفین کی جانب سے دیا گیا ایک بڑا موضوع 'عرفانِ ذات' ہے جو ظاہر ہے اپنا سماجی تناظر رکھتا ہے، بہت سے جذباتی نعروں کی تحلیل، جابرانہ نظام کے تسلسل عالموں اور دانشوروں کی ریاکاری اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مقروض آدمی کی کرب ناک خوشحالی نے وجودی فکر کی لایعنیت کے لئے پذیرائی کا تخلیقی ماحول بنا دیا، خاندان اور سماجی اقدار کا بکھراؤ، عقیدے کی دنیا میں یقین کے فریب کی جگہ، سائنسی فکر سے جنم لینے والے بنیادی سوالات اور ان کے متوازی صدیوں کی متصوفانہ روایت، جس نے بہت کچھ سوچنے اور اس پر کڑھنے کی زحمت سے بچانے کا حیلہ پیش کیا، داخلی دھمال یا کشفِ ذات کے گمان کو افسانے میں ایسا دل پذیر بنا دیا کہ رشید امجد جس نے گذشتہ عشرے میں عسکری آمریت کے خلاف بعض زوردار افسانے لکھے ('شہر بدری'، 'سراب'، 'دھندلکا'، 'بکھری ہوئی کہانی'، 'الجھاؤ' اور 'متلاہٹ') وہی 'بند کوئیں میں سرسراہٹ'، 'دھند منظر میں رقص' اور 'سمندر مجھے بلاتا ہے' لکھ رہا ہے ، تاہم اس عرصے میں اُس نے 'ست رنگے پرندے کے تعاقب میں' جیسا خوبصورت افسانہ لکھا۔ اپنی ذات کی شناخت کے لیے اساطیر یا اجتماعی لاشعور میں جھانکنے کے ساتھ ساتھ ایک اور رویہ تاریخی و تہذیبی اور تنقیدی شعور کا بھی ہے، جس کی بہترین مثالیں قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور نیر مسعود کے ہاں ملتی ہیں۔ ہمارے ہاں اسد محمد خان نے بھی 'نربدا' اور دوسری کہانیوں میں اسی اسلوب میں فنی تصرفات کر کے موثر بیانیے تخلیق کیے۔ سیاسی تصورات کے حوالے سے خالدہ حسین اور زاہدہ حنا دو متضاد منطقوں سے تعلق رکھتے ہیں مگر ایک نے متکلم کے نسائی قالب کی تلاش کی۔ معرفت سے ہم رنگ آہنگ دریافت دیا جبکہ دوسری تخلیق کار نے پاکستان کے شہر جہلم میں مدفون اپنے پرکھوں کی کھوج میں اِس دھرتی کو ایک نئی معنویت دی تاہم مسعود اشعر اُن افسانہ نگاروں میں سے ہے جس نے افسانے کو ایک وسیع المطالعہ شخص کی بازگوئی کے عمل کو تخلیقی عمل بنا دیا اور اس کے ساتھ ساتھ ایسے بوڑھے افراد میں پروان چڑھنے والی اُس جواں سال آرزوئے رفاقت کو بھی افسانے کا موضوع بنایا جو آہستہ آہستہ حکیموں کی معجونوں کی محتاجی سے نکل کر کچھ کیپسولوں کی بدولت باقی ماندہ عمر کو یادِ الٰہی میں وقف کرنے کی بجائے یادِ مخلوقِ الٰہی میں صَرف کرنے کی اُمنگ رکھتی ہے۔

شخصی حکمرانوں اور ان کے ساتھیوں کی عافیت اسی میں ہوتی ہے کہ عوام 'افیونی' ہو جائیں، چنانچہ حکمرانوں کی جانب سے انہیں تعلیم، طبّی سہولتیں یا سماجی انصاف کی بجائے جشن، میلے، کرکٹ میچ، دنگل اور بازاری لٹریچر وافر مقدار میں فراہم کئے جاتے

ہیں، چنانچہ اسی دور میں افسانے کے نام پر عامیانہ ڈائجسٹوں نے لذیت، سطحیت اور نام نہاد ماورائیت سے بھرپور کہانیوں کا بازار گرم کر دیا، اس صورت حال کی ذمہ داری خود افسانہ نگار پر یوں عائد ہوتی ہے کہ اس نے دانشوری کے زعم میں کہانی کے عنصر کو افسانے سے خارج کر کے اسے علوم کا کیپسول یا تحلیل نفسی کا چارٹ بنا ڈالا تھا، مگر یہ امر خوش آئند ہے کہ گزشتہ برسوں میں افسانہ نگار کو احساس ہوا ہے کہ کہانی کے الاؤ پر جن بہروپیوں نے قبضہ جمایا ہے انہی نے اس کے اعتبار کو بھی گم کیا ہے، اس لئے آہستہ آہستہ اردو افسانے میں بھی ایک 'میثاقِ جمہوریت' تیار ہوا ہے، جس میں ابلاغ کی حرمت کو تسلیم کیا گیا ہے۔

قیام پاکستان سے پہلے بھی ہمارا معاشرہ دو الگ الگ خطوں میں ہی نہیں تہذیبی رویوں میں سانس لیتا تھا، دیہی اور شہری آزادی سے پہلے پریم چند نے دیہی معاشرت کو بطور خاص مشاہدے کا مرکز بنایا، آزادی کے بعد پاکستان میں احمد ندیم قاسمی، غلام الثقلین نقوی اور ذکا الرحمٰن نے دیہی اور مضافاتی کلچر کے نقش افسانے کے کینوس پر ابھارے، اس سلسلے میں افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے دو رنگ ہیں، ایک تو رومانی عینک سے دکھایا گیا جب کہ دوسرے میں عدم مساوات، محرومی، جہالت اور استحصال کی بدصورتی نمایاں ہے اس میں شک نہیں کہ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد سیاسی قوت کا اجارہ پنجاب کے زمینداروں اور جاگیرداروں، سندھ کے وڈیروں، سرحد کے خوانین اور کبھی بلوچستان کے سرداروں کے ہاتھ میں رہا۔ ان کی اپنی قوت کا اسرار تقاضا کرتا تھا کہ کبھی ثقافت کے نام پر، کبھی روایات کے نام پر اور کبھی عقیدے کے نام پر اپنی رعایا کو پسماندہ جاہل اور جہالت پر راضی رکھا جائے چنانچہ آزادی کے بعد بھی ہماری دیہی زندگی کو خاطر خواہ سہولتیں میسر نہ آسکیں اور اس طرح آج جب کہ ہم فخر سے کہتے ہیں کہ فاصلے سمٹ گئے ہیں، زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں اور ایک بین الاقوامی کلچر وجود میں آچکا ہے تب بھی ہمارے ہاں شہر اور دیہات دو الگ الگ دنیاؤں کا نقشہ پیش کرتے ہیں اور اردو افسانے نے ہمیشہ اس صداقت کی شہادت دی ہے۔ پاکستان میں قائم نامنصفانہ نظام نے جس طرح کی بے بسی، فکری انتشار اور جذباتی الجھاؤ کو پیدا کیا ہے، ہمارا افسانہ ایک عشرے تک اس کا مرقع بنا رہا گزشتہ ایک عشرے میں فہمیدہ ریاض، طاہرہ اقبال، شہناز شورو اور نیلم احمد بشیر کے افسانوں کی صورت میں ہمارے سماج میں کوشش کر کے چھپائے گئے گوشے اِس طرح سے بولنے لگے ہیں کہ لوگوں نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ مردانہ فوقیت پر قائم سماج کا بھرم ٹوٹنے میں ہی شاید ہماری اجتماعی زندگی کا وقار ہے، تاہم اس سلسلے میں افسانوں میں تین طرح کا 'پاکستانی' پیش ہوا: (۱) نفرت، حقارت اور بیزاری کی پوری قوت سے اشیاء کو مسلنے، تصورات کو پاش پاش کرنے اور اجتماعی مقاصد کو مسترد کرنے میں مصروف، (۲) سنگین حقائق سے خوف زدہ ہو کر وحشی رنگوں کا فریب بننے میں منہمک، (۳) ظلم، استحصال اور جہالت کے خلاف جدوجہد کرنے میں مشغول۔ اور یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ ہمارے ہاں پہلے دو رویوں کو ''جدید حسیت'' خیال کرنے والے افسانہ نگار بھی آمرانہ دور میں عدل، سچائی اور امید کا دامن تھام کر استحصالی قوتوں کے مقابل صف آراء ہو گئے مگر اس مزاحمت کی بھی دو سطحیں ہیں، ایک پر تو ترقی پسندی کا کتابی تصور رکھنے والے افسانہ نگاروں کی تخلیقی کاوشیں ہیں جو انفرادی اور اجتماعی تشخص کی گمشدگی، جبر و تشدد، اظہار کے مسدود راستوں، اخلاقی و تہذیبی انتشار اور غیر یقینی حالات

کے پیش نظر یہ ''تاریخی'' رویہ اختیار کرتے ہیں کہ ان تضادات کو اور نمایاں کیا جائے زوال کے ''اسباب'' کو تقویت دی جائے تا کہ انقلاب کی صبح طلوع ہو سکے، جب کہ دوسرے افسانہ نگار یہ مؤقف اختیار کرتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام پر مبنی مغربی سماج کی افسردگی اور آزردگی کے اسباب پر نظر رکھی جا سکے، اس امر کی احتیاط کی جائے کہ پاکستانی معاشرہ اس تمدن اور تہذیبی انجام تک نہ پہنچے، اس سلسلے میں یہ افسانہ نگار عدل، حسن اور محبت سے منسلک اقدار کی ایجابی قوت کی مدد سے مزاحمت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

بھلے شمس الرحمٰن فاروقی کہیں ''جس صنف کی عمر ابھی آپ کے یہاں مشکل سے ستر پچھتر سال ہو اس میں کسی عظیم تحریر کا امکان زیادہ نہیں ہو سکتا۔'' (شمس الرحمٰن فاروقی، افسانے کی حمایت میں، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۰) یہ حقیقت ہے کہ اس مختصر عمر کو روایتی پیمانوں سے نہیں ناپا جا سکتا۔ ۲۰ ویں صدی تو ویسے بھی اس اعتبار سے قیامت کی صدی تھی کہ اس کا ہر پل، ہر گھڑی آگہی کے نئے منظر کو پیدا کرتا رہا اور ایک جہانِ حیرت ہے جو اکیسویں صدی میں بھی جلوہ نما ہے مگر اتنے بہت سے فلسفیوں، پیغمبروں، کتابوں، سیاسی نظریوں، تہذیبی قرینوں کے باوجود دنیا میں حیوانی جبلتوں اور انسانی اقدار کے مابین، نام نہاد اشرافیہ اور ذلت کے مارے لوگوں کے مابین ایک جدل جاری ہے جس میں اب سرمایہ دارانہ نظام کا سب سے بڑا حربہ رُوبہ عمل ہے، گلوبیت کے نام پر جس کا دعویٰ ہے کہ انسانوں کے مابین ہر طرح کی تفریق مٹائی جا سکتی ہے۔ زبان، نسل، قوم، علاقہ، یا کوئی اور حوالہ جو انسانوں کو تقسیم کرتا ہو، قوموں کو تقسیم کرتا ہو، سب بے معنی ہو رہا ہے مگر یہ دعویٰ دار دنیا کو اُسی طرح تقسیم کیے ہوئے ہیں، ایک دنیا زرداروں کی ہے جو پروڈیوسرز ہیں اور دوسری دنیا بے زروں کی ہے جو صارف ہیں لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی محافظ قوتیں اپنی مرضی کی دنیا بغیر رکاوٹ یا مزاحمت کے تشکیل نہیں دے سکتیں، اس کے متوازی تخلیق کاروں کا ایک ڈسکورس ہے جو دنیا کو ایک گاؤں بنانے والوں کو اس طرف متوجہ کر رہا ہے کہ اس گاؤں کی ضرورت تازہ ہوا، روشنی اور پانی کے ساتھ وہ پرندہ بھی ہے جو فنونِ لطیف اور تخلیقی عمل کا اعتبار قائم رکھتا ہے۔

## ماخذات:


۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ''افسانے کی حمایت میں'' مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء۔

۲۔ انتظار حسین، ''علامتوں کا زوال'' سنگِ میل، لاہور، ۱۹۸۳ء۔

۳۔ صفیہ عباد ''رشید امجد کے افسانوں کا فنی و فکری مطالعہ'' پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء۔

۴۔ ڈاکٹر شفیق انجم، ''اردو افسانہ'' پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء۔

۵۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف، ''رفتہ و آیندہ'' پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء۔

۶۔ ڈاکٹر رشید امجد، ''عام آدمی کے خواب'' حرف اکادمی، راولپنڈی، ۲۰۰۶ء۔

۷۔ اسد محمد خاں، ''جو کہانیاں لکھیں'' اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۶ء۔

۸۔ اشفاق احمد، ''بابا صاحبا'' سنگِ میل، لاہور، ۲۰۰۸ء۔

۹۔ اشفاق احمد، ''طلسمِ ہوش افزا'' سنگِ میل، لاہور، ۲۰۰۰ء۔

۱۰۔ اشفاق احمد، ''صبحانے افسانے'' سنگِ میل، لاہور، ۲۰۰۲ء۔

۱۱۔ اشفاق احمد، ''ایک ہی بولی (پھلکاری)''، سنگِ میل، لاہور، ۲۰۰۲۔

۱۲۔ خالدہ حسین، ''میں یہاں ہوں''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء۔


## جرائد:


۱۔ 'دنیازاد'، کراچی (مدیر: آصف فرخی) شمارے، ۲۱، ۲۲، ۲۳ (۲۰۰۸)

۲۔ 'آج'، کراچی (مدیر: اجمل کمال) شمارے، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱ (۲۰۰۸)

۳۔ 'مکالمہ'، کراچی (مدیر: مبین مرزا) شمارے، ۱۴۔۱۵ (۶۔۲۰۰۵)

۴۔ 'ارتقاء'، کراچی (مدیر: ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر سید جعفر احمد، واحد بشیر) شمارے، ۴۴، ۴۵، ۴۶ (۲۰۰۸) شمارہ، ۴۷ (۲۰۰۹)


(2009.9.10 受理)